

مثنوی رومی کی دعائیں

دعائے عربی کا لفظ اور باب ”نصرینصر“ سے ہے جس کے لغوی معنی بلانے، پکارنے، رغبت کرنے، منسوب کرنے، نام رکھنے اور کسی کام کی طرف لے جانے کے ہیں۔ اس کے علاوہ عبادت کرنے اور مدد طلب کرنے کے معنوں میں بھی مستعمل ہے۔ اس کے اصطلاحی معنی خدا سے بزرگ و برتر سے استمداد و استغاثہ کے ہیں، خواہ یہ استغاثہ و استمداد اپنے یا کسی کے حق میں ہو یا کسی کے خلاف۔ اللہ تعالیٰ سے دعائیں طرح سے ہوتی ہیں، اس کی توحید بیان کرنا اور اس کی حمد و ثنا کرنا، اس کی ذات باری سے غفودہ درگزر اور رحم و کرم کی درخواست کہ جس سے اس کا قرب میسر آئے اور تیسرے دنیا کی بھلائی کی درخواست کرنا تحلیل و تھمید بھی دعائیں کے زمرے میں آتی ہے کہ یہ بھی ایک ذریعہ ہے اللہ جل شانہ سے حصول جزا کا۔ اکثر احادیث رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم میں دعا کی فضیلت و اہمیت کی وضاحت ملتی ہے، اور اسے عبادت کہا گیا ہے۔ ہر قسم کی دعا، جس میں قضاے حاجات کے لیے دعا بھی ہے، صرف اللہ ہی سے کی جانی چاہیے۔ غیر اللہ سے دعا کرنا نہ صرف بہت بڑی گمراہی بلکہ شرک عظیم اور کفر ہے۔ دعائیں ہمیشہ ایک باضابطہ استدعا کا تصور شامل ہوتا ہے، چاہے یہ دعائے خیر ہو یا دعائے بد۔ حالات کے مطابق دعا، یعنی خدا سے استدعا کرنا، کئی طرح کی ہو سکتی ہے اور اس لحاظ سے دعا کا ترجمہ ذاتی التجا کرنا بھی ہے۔

مسلمانوں کی مذہبی زندگی میں دعا کی بڑی اہمیت ہے۔ متقی مسلمانوں کے نزدیک دعا، انسان اور کرہ سماوی کے درمیان رابطہ نہیں بنتی بلکہ اصل رابطہ براہ راست دعا کرنے والے اور خدا کے درمیان ہے۔ ابتدائی فارسی مثنویوں میں دعا کا عنصر بہت کم ہے اور اگر کہیں ہے بھی تو کسی خاص موقع پر ہی نظر آتا ہے۔ فارسی مثنوی نگاروں میں سب سے پہلے غالباً نظامی گنجوی نے مثنوی میں، اور وہ بھی اس کے آغاز ہی میں باقاعدہ مناجات یا دعا کا باب قائم کیا۔ اس سے قبل کسی فارسی مثنوی میں ایسا باب دیکھنے میں نہیں آتا۔ اس لحاظ سے نظامی اس روایت کا بانی قرار پاتا ہے۔ بعد میں خمسہ نظامی کی پیروی میں لکھی جانے والی تمام مثنویوں میں یہ روایت بھرپور انداز میں نظر آتی ہے۔ نظامی کی تین مثنویوں میں

مناجات کا الگ کوئی باب نہیں ہے بلکہ آغاز ہی میں دعا ہے یا ثنا کے بعد دعائیں اشعار ہیں۔ البتہ سکندر نامہ میں ایک باب ہے اور مخزن اسرار میں دو باب قائم کیے گئے ہیں۔ خمسہ نظامی کا جواب لکھنے والوں نے جہاں اس روایت کو پورے طور پر نبایا وہاں اس میں کچھ اضافہ بھی کیا، یعنی مناجاتِ اول اور مناجاتِ دوم کے علاوہ مناجاتِ سوم اور مناجاتِ چہارم کے بھی باب قائم کیے۔ مثلاً خمسہ کی مثنوی مطلع الانوار میں مناجات کے تین باب اور جامی کی تحفۂ احرار میں چار ابواب ہیں، جب کہ خواجہ کوٹلی نے گوہر نامہ میں حمدیاری اور نعت پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) کے بعد مناجات کا باب رکھا ہے۔

مولانا رومی نے اس ضمن میں کسی قسم کی تقلید سے کام نہیں لیا، بلکہ اپنا انداز برقرار رکھا ہے۔ ان کی مثنوی میں جتنی دعائیں ہیں، ان میں سے چند ایک تو قرآنی ہیں جن کا ذکر کسی خاص مناسبت سے آگیا ہے، اور کچھ موقع و محل کے مطابق کسی شخص کی یا خود مولانا کی اپنی ذات کے لیے ہیں۔ ان میں اگر کہیں خدائے بزرگ و برتر سے بخشش و مغفرت کی استدعا ہے تو کہیں، بلکہ زیادہ تر، نفسِ امارہ کی رست سے محفوظ رکھنے کی التجا کی گئی ہے، کہیں دعا، ظالموں اور ستم کاروں کے خلاف حضورِ حق فریاد و فغان کی صورت میں نظر آتی ہے، اور کہیں خود مولانا کسی دوسرے آدمی کو کسی پریشان کن صورت حال سے نجات پانے کے لیے دعا کرنے کی تلقین کرتے ہیں اور کہیں یہ دعا مناجات کی صورت میں نظر آتی ہے۔

دفترِ اول میں ایک یہودی بادشاہ کی حکایت بیان ہوتی ہے جو نصاریٰ کو اپنے مذہب ہی تعصب کی بنا پر قتل کروا دیا کرتا تھا۔ اس کے مکار وزیر نے اسے اس قتلِ عام سے روکا کہ بقول اس کے نصاریٰ ڈر کے مارے اپنی مذہبی وابستگی چھپانے لگے تھے۔ اس کا حل اس نے اس بات میں تلاش کیا کہ ان میں باہم پھوٹ ڈال دی جائے تاکہ اس طرح وہ اپنے آپ ہی ختم ہو جائیں۔ چنانچہ بادشاہ نے اس کی تجویز کے مطابق وزیر کو برسرِ دربار فریاد کیا، اور وہ ترکہ و بار کر کے نصاریوں میں شامل ہو گیا۔ اس نے خود کو عیسائیت کا مبلغ ظاہر کر کے اس کا پرچار شروع کر دیا۔ نصاریٰ اس وزیر سے متاثر ہو کر اس کی طرف متوجہ ہونے لگے۔ غرض وزیر کا جادو چل جاتا ہے، نصاریٰ اس کے انتہائی عقیدت مند بن جاتے اور اسے نائبِ عیسیٰ کہنے لگتے ہیں، حالانکہ وہ دجال محض تھا۔۔۔ دجال کے ذکر کے بعد مولانا پُروردہ دانداز میں ان نت نئی رکاوٹوں اور مشکلوں کا تذکرہ اور ان سے نجات کی دعا کرتے ہیں، جو نفسِ امارہ قدم قدم پر حرص و ہوس اور ایسی ہی دوسری صورتوں میں انسان کے راستے میں پیدا کرتا رہتا ہے۔

اس نفس نے ہزاروں دلم و دانہ پھیلا رکھے ہیں اور آدمی حریص پسندے کی مانند، اپنی تمام تر عظمت کے باوجود ہر لحظہ اس کے ایک نئے دلم میں پھنس رہا ہے۔ مولانا نے اس سلسلے میں اللہ جل شانہ کی عنایات پیہم اور انسان کی بے بسی اور جگر گداز مجبوری کا ذکر کر کے نفس کے ہاتھوں انسانی اعمال کے ضیاع کو انبارِ گندم اور چوپے کی سیدھی سادی روزمرہ کی تمثیل سے واضح کیا ہے۔ فراتے ہیں کہ ادھر ہم گندم کا انبار لگاتے جاتے ہیں، ادھر یہ انبار اندر ہی اندر ختم ہوتا چلا جاتا ہے۔ ہمارا دھیان اس طرف آتا ہی نہیں اور نہ ہم اس پر غور کرنے کی کوشش ہی کرتے ہیں کہ ہماری اس گندم کو چو باڑی ہوشیاری اور چالاکی سے ختم کیے جا رہا ہے۔ اس چوپے (نفس) نے ہمارے انبارِ اعمال میں نقب لگا کر اُسے کمال مکاری سے ختم کر کے رکھ دیا ہے۔ دوسرے لفظوں میں شیطانی وساوس آدابِ عبارت کی بجا آوی سے مانع آتے ہیں۔ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ انھوں نے حضور اکرم سے نماز میں ادھر ادھر دیکھنے کے بارے میں سوال کیا تو سرورِ کونین نے فرمایا یہ ایک جھپٹا ہے کہ شیطان بندے کی نماز میں سے جھپٹ لیتا ہے۔ مولانا کے مطابق ضروری ہے کہ انسان پہلے اس نفس کے شر کو دور کرے، پھر اعمال کی طرف متوجہ ہو۔

مولانا فخرِ موجودات (صلی اللہ علیہ وسلم) کی حدیثِ مبارکہ ”حضور کی بغیر نماز مکمل نہیں ہوتی“ کا حوالہ دے کر مذکورہ بالا تمثیل کو آگے بڑھاتے اور اللہ تعالیٰ کے حضور دستِ دعا بلند کرتے ہیں۔ اس دعا میں نفسِ شوم کے مکر سے بچنے کے لیے اس ذاتِ اقدس کی عنایات و انتفات کی بالواسطہ طور پر التجا کی گئی ہے اور وہ اس طرح کہ اگر تیری عنایات ہمارے شاملِ حال ہو جائیں تو اس دردِ نسیم یعنی نفس کا کیا ڈر۔ تیری ذاتِ پاک اگر ہم پر توجہ و انتفات فرما دے تو اس نفس کی طرف سے ہر تر قدم ہزاروں دلم بچھائے جانے پر بھی ہمیں ذرہ بھر پروا یا پریشانی نہ ہوگی:

امی خدا فریاد رس نعم المعین	اوسیر دجال یک چشم لعین
ماچو مرغانِ حریصِ بینوا	صد ہزاران دلم و دانہ است اینخدا
مہر کی گریز باز و سیر غی شوم	دمدم پابستہ دلم نویم

می رہانی سر دمی مارا و باز سوی دامی میر ویم ای بی نیاز
 مادرین انبار گندم می کنیم گندم جمع آمدہ گم می کنیم
 می نیندیشیم آخر ما بهوش کاین خلل در گند مست از مگر موش
 موش تا انبار ما حفرہ زد است وز نقش انبار ما ویران شد است
 اقل اسے جان دفع شر موش کن و آنکہ اند جمع گندم جوش کن
 بشنو از اخبار آن صدر صدور لا صلوة تمّ الا بالحضور
 گرنہ موشی دزد در انبار ماست گندم اعمال چل سالہ کجاست
 ریزہ ریزہ صدق ہر روزہ چرا جمع می ناید در این انبار ما
 چون عنایتت شود با ما مقیم کی بودیمی از آن دزد لیتیم
 گر ہزاران دام باشد ہر قدم چون تو بامانی نباشد ہیچ غم

اسی دفتر میں ایک شیر اور جنگلی جانوروں کی لمبی چوڑی تمثیل بیان ہوئی ہے، جس میں جانور شیر سے اپنی
 جان بچانے کی خاطر اسے قناعت و توکل کا درس دیتے ہوئے دکھائے گئے ہیں۔ انہی جانوروں میں ایک
 خرگوش بھی ہے جو اپنی عیاری سے شیر کو ایک کنوئیں پر لے جانے اور اسے یہ سمجھانے میں کامیاب ہو جاتا
 ہے کہ کنوئیں میں ایک اور شیر چھپا بیٹھا ہے جو اس کا دشمن ہے، اور یوں شیر کنوئیں میں اپنا ہی عکس
 دیکھ کر چھلانگ لگا دیتا اور ختم ہو جاتا ہے۔ اس تمثیل کے آخری حصے میں مولانا نے یہ نتیجہ نکالا ہے
 کہ جس کسی نے دشمن کی بات پر یقین کیا اس کا حشر اس شیر الیسا ہی ہوا۔ دشمن اگر محبت اور دوستی
 کی بھی بات کرے تو اسے دام ہی سمجھنا چاہیے۔ اس کی قند بھی زہر ہی ہوگی۔ لیکن جب مقدر ہی میں
 ایسا معاملہ ہو تو انسان، دوست اور دشمن میں تمیز کرنے سے عاجز رہ جاتا ہے۔ اس صورت میں مولانا کے
 مطابق، اللہ کے حضور گریہ و زاری اور عجز و نیاز سے کام لیتے اور تسبیح و روزہ کی طرف توجہ کرتے ہوئے
 دعا کرنی چاہیے۔ ... یہاں مولانا نے جو دعا تلقین فرمائی ہے اس میں اللہ جل جلالہ کو علام الغیوب، کریم الغفور
 اور سار الغیوب ایسی صفات سے خطاب کرتے ہوئے اسی در دھرے اور پُر تاثیر لہجے میں مکرر بد کے پتھر

کے نیچے کچلے جانے سے محفوظ رکھنے، گناہوں کی سزا نہ دینے اور تمام موجودات کائنات کی صحیح صورت دل پر ظاہر کرنے کی التجا کی گئی ہے۔ پھر اپنی کوتاہیوں اور لغزشوں کو گناہین اور نفس کو شیر قرار دے کر کہا گیا ہے کہ ہم سے اگر لغزشیں سرزد ہوئی ہیں تو ان کی وجہ سے اس نفس کو ہم پر مستط نہ فرما حقیقتِ اشیاء اور صحیح صورت حال ہم پر واضح فرماتا کہ خواہشاتِ نفس سے مغلوب ہو کر ہم کہیں غلط کو صحیح اور مضر کو مفید نہ سمجھ بیٹھیں۔ جو کوئی تیرے قمر کا مظہر بنتا ہے وہ ”نیست“ (خانی) ہوتے ہوئے بھی ہستی و خود پسندی کا شکار ہو کر ظلم و تعدی کا بازار گرم کرنا اور کسی کی نصیحت سننے کو تیار نہیں ہوتا۔

چون قضا آید نہ بینی غیر دوست	دشمنان را باز نشناسی زد و دست
چون چنین شد اہمال آغاز کن	نالہ و قہقہ و روزہ ساز کن
نالہ میکن کامی تو علامِ العیوب	نیر سنگ مکر بد مارا مکوب
یا کہیم العفو ستار العیوب	انتقام از ماکش اندر ذنوب
آنچه در کوفت ز اشیاء آنچہ میت	وانما جان را بہر حالت کہ نہ میت
گر سگی کردیم اسی شیر آفرین	را گمار برما زمین کین
آب خوش را صورت آتش مدہ	اندر آتش صورت آبی منہ
از شراب قمر چون مستی دہی	نیست بار صورت ہستی دہی

سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالے سے مولانا نے دو فرشتوں کی دعا اور اس کی تفسیر بیان کی ہے۔ اس کی دعائیں رب کریم سے اصحابِ انفاق کے لیے اجرِ عظیم اور ان کے مال میں خیر و برکت اور غیلوں کے لیے تباہی و بربادی اور زیان و نقصان کی درخواست کی گئی ہے۔ یہاں صاحبِ انفاق سے مراد مجاہدِ راہِ حق ہے، نہ کہ نفسانی خواہشات پر چلنے والا سُرف۔ اس دعا کے سلسلے میں حضرت بحر العلوم کا کہنا ہے کہ بعض اہل تصوف کے نزدیک انسان میں موجود قوتِ ملکیتِ خدا دیتی ہے اور یہ خدا ہر شخص میں ہر وقت ہوتی ہے، اسے صرف گوشِ دل ہی سے سنا جاسکتا ہے۔ اور انہی کے بقول، فرشتے کی یہ نہا عالمِ ملکوت ہی میں ہوگی، کیونکہ اگر اس دنیا میں ہوتی تو ہر کوئی اُسے سن لیتا۔ اس ضمن میں انھوں

نے حضرت جبریل کی مثال دی ہے کہ جب وہ انسانی شکل اختیار کر کے حضورؐ کے پاس آئے اور ایمان و اسلام کے بارے میں حضور اکرمؐ سے سوال کیا تو اس دنیا میں ہونے کی وجہ سے تمام حاضرین نے ان کی نداسن کی۔

گفت پیغمبر کہ دایم بہر پند دو فرشتہ خوش منادی می کند
کای خدا یا منفقان را سیر دار ہر در مشان را عوض دہ صد ہزار
ای خدا یا مسکان را در جہان تو مدہ الا زیان اندر زیان
ای خدا یا منفقان را دہ خلف ای خدا یا مسکان را دہ تلف
منفق و مسک محل بین بہ بود چون محل باشد موثر می شود

دفتر دوم میں ایک مفلس قیدی کی داستان بیان ہوئی ہے۔ اس کے آخر میں صالح حقیقی کی کاریگری کے ذیل میں یہ بتایا گیا ہے کہ کس طرح وہ عدم سے وجود میں لاتا ہے۔ گویا اس کی ایجاد کا تعلق عدم اور نیستی سے ہے۔ اس بنا پر مولانا ”نیستی“ کی طرف مائل ہونے کی تلقین کرتے ہیں تاکہ بقائے حق میں فنا ہو کر ابدیت و بقا حاصل ہو سکے۔ اسی تلقین یا خیال کے پیش نظر وہ خدا کی طرف رجوع کرتے اور مشغول دعا ہو جاتے ہیں۔ ان کی یہ دعا ”فی المناجات“ کے ۱۱، ۱۰ اشعار پر مشتمل ہے۔ شروع کے چند اشعار میں یہ دعا اپنے اصطلاحی معنوں میں نظر آتی ہے اور باقی اشعار میں اس لاثانی و لافانی کی بعض عناصروں کا ذکر ہے۔ اس دعا میں خدائے پاک کو وعدہ لا شریک کہہ کر اس سے دست گیری کرنے، گناہوں سے درگزر فرمانے اور ایسی باتیں سکھانے کی عاجزانہ التجا کی گئی ہے، جو اس کی رحمت کے حصول کا سبب بن سکیں۔

۴۴ حضرت عرفا روق سے روایت ہے (اور یہ روایت بخاری اور مسلم دونوں میں آئی ہے) کہ ہم حضور اکرمؐ کی خدمت اقدس میں بیٹھے تھے کہ ایک شخص اُجلے سفید کپڑے پہنے (سیاہ بالوں والا) سرور کوئین کے پاس آیا اور حضورؐ کے زانو سے زانو ملا کر اور اپنی دونوں ہتھیلیاں حضورؐ کے زانو پر رکھ کر بیٹھ گیا۔ (اس پر نہ تو سفر کا کچھ اثر معلوم ہوتا تھا جو اسے مسافر سمجھا جاتا اور نہ ہم میں سے کوئی اُسے پہچانتا ہی تھا۔ اس نے نبی کریمؐ سے اسلام، ایمان اور احسان کے بارے میں دریافت کیا جس کا حضور اکرمؐ نے جواب دیا۔ جب وہ آدمی چلا گیا تو فخر موجودات نے فرمایا: اے عمر تو جانتا ہے کہ یہ شخص کون تھا؟ میں کحیرت کے لیے چُپ تھا، بولا کہ خدا اور اس کا رسول ہی بہتر جانتے ہیں۔) ارشاد ہوا کہ یہ جبریل تھا تم لوگوں کو دین سکھانے آیا تھا، تفصیل کے لیے

۴۵ کتاب شہوی، ص ۵۹۔ بحر العلوم، ص ۱۳۲/۱۔ مشنوی معنوی، ص ۱/۲

لاحظہ ہو مکتب احادیث

پھر توفیقِ خداوندی، جس کی بدولت انسان اللہ کے حضور ہاتھ پھیلا کر عفو و درگزر کی درخواست کر سکتا ہے، اجابتِ حق اور خدا کی غفاری و قہاری کا ذکر کر کے اپنی خطاؤں کی اصلاح کی گزارش کی گئی ہے، اس لیے کہ یہ بھی (اصلاح وغیرہ) اسی کے دستِ قدرت میں ہے۔

ای خدا ی پاک بنی انباز و یار دست گیر و جرم مارا در گزار
یاد ده مارا سخنهای رقیق که ترارحم آورد آن ای رفیق
ہم دعا از تو اجابت ہم ز تو ایمنی از تو مہابت ہم ز تو
گر خطا گفتم اصلاحش تو کن مصلحی تو، ای تو سلطان سخن
کیسما داری کہ تبدیلیش کنی گر چه جوی خون بودیش کنی
این چنین مینا گر یہا کار تست این چنینی اکیر باز اسرار تست

دفعہ دوم ہی میں دورِ حضرت موسیٰ کے ایک گڈریے کی مناجات بیان ہوئی ہے۔ اس مناجات میں جس سیدھے سادے انداز میں خدا کو مخاطب کیا گیا ہے، اس کی نظیر کمیں دیکھنے میں نہیں آتی۔ یہ مناجات ایک سادہ فطرت نادران انسان کی انتہائی سادگی لیکن محبوبِ حقیقی سے بے پناہ محبت، والہانہ شفیقتگی اور خدا اس کی بڑی دلکش و جاذب تصویر پیش کرتی ہے۔

گڈریے کی اسی سادگی، بالفاظِ دیگر گستاخی نے حضرت موسیٰ کو براؤنختہ کر دیا اور انھوں نے اُسے ڈانٹا، لیکن اللہ تعالیٰ کی طرف سے حضرت موسیٰ پر عتاب نازل ہوا کہ تو نے ہمارے بندے کو ہم سے جدا کر دیا۔ ہم نے ہر کسی کو الگ الگ سیرت سے نوازا ہے۔۔۔ یہاں مولانا کو یہ بتانا مقصود تھا کہ ایرانِ عالم کی نسبت ملتِ عشق کا انداز بالکل جداگانہ ہے اور عشاق کو صرف اس محبوبِ حقیقی ہی سے سروکار ہے اور بس:

ملتِ عشق از ہمہ دینہا جداست عاشقان را مذہب و ملت خداست

اب ذرا گڈریے کی دعا و مناجات ملاحظہ ہو: اے خدا تو کہاں ہے، کس جگہ ہے کہ میں تیرا چاکر بنوں، تیرا جوتا سیدوں، تیرے سر میں کنگھی کروں۔ اے خدا میری جان تجھ پر فدا ہو، میرے بال بچے میرا سب خاندان تجھ پر قربان، تو کہاں ہے؟ کہ میں تیرے اُلجھے ہوئے بال سلجھاؤں اور تیرے جوتے کو

ٹانکے لگاؤں، تیرے کپڑے دھوؤں، تیرے سر کی جوئیں ماروں، اے صاحبِ شمت تیری خدمت میں دو دھپیش کروں۔ اگر تو بیمار پڑ جائے تو میں دل و جان سے تیری تیمارداری کروں، تیرے پیارے پیارے ہاتھوں کو چوموں، تیرے سند پاؤں دباؤں اور جب تجھے نیند آنے لگے تو تیرا بستر جھاڑ پونچھ کر صاف کروں۔ اگر مجھے تیرے گھر کا پتہ مل جائے تو میں تیرے لیے دو دھ اور گھی لے کر پہنچا کروں۔ صرف یہی نہیں بلکہ لذیذ و دلکش دہی کے ٹکے بھی ساتھ لایا کروں۔ یہ ساری اشیاء تیار کر کے میں صبح و شام تیرے پاس لایا کروں، میرا کام لانا ہوا اور تیرا کام کھانا۔ اے خدامیری تمام بکریاں تجھ پر قربان ہیں، تیری یاڈیں سراپا آہ و زاری ہوں :

دید موسیٰ یک شبانی را براء	کو یہی گفت ”ای خدا وای آلہ
تو کجائی تا شوم من چاکر ست	چارقت دوزم کنم شانہ سرت
ای فدای من فدایت جان من	جملہ فرزندان و خان و مان من
تو کجائی تا سرت شبانہ کنم	چارقت را دوزم و بجہ زخم
جامہ ات شوم، پیشبایت کشم	شیر پیشت آورم ای محشم
در تراباری آید پیش	من ترا غنوار باشم بچو خویش
دستکت بوسم بمالم پاکت	وقت خواب آید، بروم جاکت
گر بمینم خاندات را من دوام	روغن و شیرت بیارم صبح و شام
ہم پنیر و نان ہای روغنیں	خمر با چغرات ہای نازنین
سازم و آرم پیشت صبح و شام	از من اور دن ز تو خوردن تمام
ای فدای تو ہمہ بزمای من	ای بیادت ہی ہی وہیہای من

اسی دفتر میں ایک بیمار صحابی کی داستان میں دو دعائیں بیان ہوئی ہیں۔ پہلی دعا خود مصیبتی کی ہے۔ جنہوں نے اس خوف سے کہ گناہ گاروں کو روز قیامت شدید عذاب ہوگا، خدا کے حضور یہ التجا کی کہ انہیں جو کچھ بھی عذاب ہونا ہے اسی دنیا میں ہو جائے تاکہ آخرت میں اس سے نجات مل جائے۔ ان کی اس التجا

کے ضمن میں ان کی زبان سے ہاروت و ماروت کی مثال بیان کی گئی ہے، جو بقول ان کے عاقل و دانا
 تھے کہ انھوں نے عذابِ آخرت سے بچنے کے لیے اسی دنیا میں چاہ بابل کی قید اختیار کر لی۔ ان صحابیؓ کے
 مطابق ان دونوں کا یہ فعل مناسب تھا، اور وہ اس لیے کہ آگ (عذابِ آخرت) کی نسبت دھوئیں (عذابِ دنیا)
 کی تکلیف کم ہوتی ہے۔ یہاں دونوں جہانوں کی تکلیف و عذاب کا موازنہ کر کے دنیا میں انسان پر وارد ہونے
 والی تکالیف کو عذابِ آخرت سے کہیں سہل اور قابلِ برداشت بتایا گیا اور ان لوگوں کو خوش بخت کہا گیا
 ہے جو اسی دنیا میں عبادات وغیرہ کی تکالیف اٹھاتے ہیں تاکہ عالمِ آخرت میں عذاب سے بچ جائیں حضور
 اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ان صحابیؓ کی عبادت کے لیے تشریف لے جانے پر وہ اپنی اس دعا کا ذکر حضور
 سے کرتے ہیں کہ میں نے محض آخرت کے عذاب سے بچنے اور وہاں ہر طرح کی فراغت پانے کی خاطر
 اس قسم کی دعا مسلسل کی جس کے نتیجے میں مجھے اس شدید بیماری نے آلیا ... یہ دعا اس لحاظ سے عجیب
 بھی ہے اور اپنی نظیر آپ بھی، کہ شاید ہی کسی مسلمان نے عذابِ آخرت کے بدلے عذابِ دنیا کی خواہش کی ہو۔
 البتہ ہر مسلمان عذابِ آخرت سے بچنے اور بخشش و مغفرت ہی کی دعا کرتا ہے۔ تو گویا یہ دعا ان صحابیؓ کے
 اتنا نئے خشیت و تقویٰ کی نشاندہی کرتی ہے:

بچو ہاروت و ماروت از حزن	آہ میکہ دم کہ «ای خلاق من»
از خطر ہاروت و ماروت آشکار	چاہ بابل را نمودند اختیار
تا عذابِ آخرت این جا کشند	گر بزند و عاقل و ساحر و شند
نیک کردند و بجای خویش بود	سہلتر باشند ز آتش رنج دود
مہندار و وصف رنج آن جہان	سہل باشند رنج دنیا پیش آن
ابی خنک آن کو جمادی می کند	بر بدن زجر می و دادی می کند
تا ز رنج آن جہانی وار ہد	بر خود این رنج عبادت می کند
من ہمی گفتم کہ یارب آن عذاب	ہم درین عالم بران بر من شتاب
تا در آن عالم فراغت باشدم	در چین در خواست تا دم میزد
این چین رنجور بی پیدام شد	جان من از رنج بی آرام شد

صحابیؓ کی اس دعا پر حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے شدید ردِ عمل کا اظہار کیا اور اس قسم کی دعا مانگنے سے سختی کے ساتھ منع فرمایا۔ پھر ہادی برحقؓ نے ان صحابیؓ کو جو دعایا دوائی وہ قرآنی دعا اور گویا تمام دعاؤں کا پتھر ہے۔ یہ دعا قرآن کریم میں ایک مرتبہ آئی ہے۔ سورۃ بقرہ میں مومنوں کے بارے میں ایک جگہ ارشاد ہوتا ہے۔ لیکن آدمی ایسے ہیں جو کہتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار ہم کو دنیا میں بھی بہتری عنایت کیجیے اور آخرت میں بھی بہتری دیجیے اور ہم کو دوزخ کے عذاب سے بچاتیے، (آیہ ۲۰۱) اس سے قبل کفار کے متعلق ارشاد ہوا ہے کہ وہ صرف دنیا ہی کی بہتری کے خواہاں ہیں، جو انھیں ملے گی لیکن آخرت میں انھیں عذاب چکھنا ہوگا۔

مولانا نے یہ دعا معمولی سے لفظی اضافے کے ساتھ بیان کی ہے، تاہم اس کا مفہوم وہی ہے جو قرآن کریم کی دعا کا ہے۔ اس کے علاوہ حضور نبی کریمؐ کی زبانِ معجز بیان سے اللہ سے مشکلیں آسان اور راہِ ہدایت کی دشواریوں کو دور فرمانے اور ہمیشہ لطف و کرم سے نوازنے کی التجا بھی ان صحابیؓ کو سکھائی گئی ہے:

گفت پیغمبر مرآن بیمار را
این گو "کای سهل کن دشوار را
آرتنا فی دارِ دنیا نا حسن
آرتنا فی دارِ عقبانا حسن
راہ را برا چو بستان کن لطیف
مقصد ما لطف خود کن ای شریف

ان صحابیؓ کی داستان کے دوران، جو وقفوں سے بیان ہوئی ہے، شیخ بملول اور ایک سائل کا قصہ مذکور ہوا ہے۔ شیخ بملول نے خود کو دیوانہ ظاہر کر رکھا ہے، وہ کسی سے بات نہیں کرنا چاہتے، لیکن کوئی شخص بعض مسائل کا حل جاننے کے لیے کسی نہ کسی بہانے انھیں گفتگو پر آمادہ کر لیتا ہے... اس داستان کے دوسرے حصے میں مولانا نے ایک جگہ باطنی علم اور ظاہری علم و گفتار کی بحث چھیڑی اور اقول الذکر کو بہتر قرار دیتے ہوئے اللہ جل جلالہ کو اس کا خریدار بتا رہا ہے۔ پھر اس علم کے طالب بننے کی تلقین کی ہے اور اس کے ساتھ ہی انھوں نے خدائے بزرگ و برتر کے بے پایاں لطف و کرم اور بخشش و نوازش کا ذکر کر کے اس سے دست گیری فرمانے اور عیبوں سے درگزر فرمانے کی التجا کی ہے۔

جیسا کہ پہلے عرض ہوا، مولانا سب سے زیادہ نفسِ امارہ سے خوف زدہ ہیں، اس لیے جہاں بھی انھیں موقع ملتا ہے وہ انسان کے اس سب سے بڑے دشمن سے خلاصی و نجات کی خاطر اس فوجِ الجلال والا کرام کے حضور گواہی دیتا ہے۔

گوڑا کر دے کرتے ہیں۔ چنانچہ یہاں بھی ان کی یہ التجا بھر پور اور رقت انگیز انداز میں نظر آتی ہے۔ انھوں نے اس نفسِ امارہ کی پھر دستبند کیوں کر جس پر دردِ انداز اور صرف دو لفظوں میں بیان کر دیا ہے، اس سے اس کے انسان پر غلبے اور بالادستی کی پوری تصویر آنکھوں کے سامنے آ جاتی ہے۔ ... نفسِ پلید کی پھری ہڈیوں تک جا پہنچی ہے۔ انسان اس کے آگے بے بس ہے۔ وہ اس کے بند سخت میں بُری طرح جکڑا ہوا ہے۔ صرف ربِ رحیم ہی اس سے نجات دلا سکتا ہے۔ مولانا نفس کی اس زبردست گرفت کو بڑے وزنی قفل سے تشبیہ کر کے اس ذاتِ اقدس سے التجا کرتے ہیں کہ اگر تیرا فضل و کرم ہمارے شاملِ حال نہ ہو تو اس قفلِ گراں کے کھلنے کی توقع ناممکن ہے۔ پھر وہ آیتِ قرآنی ”نحن اقرب الیہ من جبل الوریثہ“ کے حوالے سے کہتے ہیں کہ چونکہ تو خود ہم سے بھی زیادہ ہمارے نزدیک ہے اس لیے ہم اپنی جانب سے تیری جانب رُخ کرتے ہیں۔ یہ نفسِ امارہ اپنی مکاریوں اور فریب کاریوں سے جس طرح انسان کو اس ذاتِ خداوندی سے دور رکھتا اور جس طرح انسان اس کے ہاتھوں بے بس ہوتا چلا جاتا ہے، اس صورتِ حال کو مولانا کمال بے چارگی سے اس طرح بیان کرتے ہیں کہ اے خدا تیرے اس قدر نزدیک ہونے کے باوصف ہم تجھ سے دور ہیں۔ پھر وہ اس صورتِ حال کو تاریکی کے مشابہ قرار دے کر خدائے لم یزل سے اسے دور کرنے اور روشنی سے نوازنے کی التجا کرتے اور اس بات کو دہراتے ہیں کہ یہ دعا تیری ہی تعلیم کردہ اور تیری ہی بخشش و عنایت ہے۔ آخر میں اس ضمن میں انھوں نے قرآنی تبلیغ (آتشِ نمرود سے...) سے استفادہ کیا ہے:

یارب این بخش نہ خدایا راست	لطف تو لطف خفی را خود تراست
دستگیر از دست ما را بخیر	پردہ را بردار و پردہ ما مَدَر
باز خرم ازین نفسِ پلید	کاروش تا استخوان ما رسید
از چو ما بیچارگان این بند سخت	کہ گشاید جز تو ای سلطانِ بخت
این چنین قفلِ گراں را ای وودود	کہ تو اندِ جُز کہ فضل تو کثود؟
ماز خود سوی تو گردانیم سر	چون تو ی از ما ما نزدیک تر
با چنین نزدیکی دوریم دور	در چنین تاریکی بفرست نور
این دعا ہم بخشش و تعلیم است	و نہ در گلخن گلستان از چہ رست

نصف سورۃ قی امیہ ۱۶۔ اور ہم نے انسان کو پیدا کیا ہے اور اس کے ہی میں جو خیالات کہتے ہیں ہم ان کو جانتے ہیں اور ہم اس کی

قوم حضرت موسیٰؑ اور اس کی پھیسانی کی داستان بیان کرتے ہوئے ایک جگہ قوم کی زبانی حضرت موسیٰؑ کے خشم اور حلم کا تذکرہ چھیڑا گیا ہے۔ مولانا انہی دو لفظوں کا سہارا لے کر رحمت ایزدی کو پکانے میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ دعا کیا ہے، اپنی بے انتہا کوتاہیوں، لغزشوں اور باعید یوں وغیرہ کا اعتراف اور اس کے جواب میں اللہ جل شانہ کی رحمت بے پایاں اور بخشش فراوان کا تذکرہ ہے۔ گویا اس طرح اس کی رحمت کو جوش میں لانے کی کوشش کی گئی ہے تاکہ مولا کریم نہ صرف انسانی لغزشوں اور خطاؤں سے درگزر فرمائے بلکہ ہر طرح کی آزمائش اور رسوائی سے محفوظ رکھے اور تاکہ شیطان کو موقع نہ مل سکے کہ وہ اسے گمراہی کی طرف لے جائے۔ یہ ساری دعا ذاتِ خداوندی کے حضور انسان کے کمالِ خضوع، انتہائے عجز و بے چارگی اور حصولِ رحمتِ باری کی کوشش کی تصویر پیش کرتی ہے دیکھنے میں سادہ الفاظ اور سیدھی سادی تشبیہات و ترکیبات، لیکن دل کی گہرائیوں سے نکلے ہوئے یہ الفاظ اپنے اندر ایک جہانِ تاثیر لیے ہوئے اور دعا کنندہ کے دردِ دروں اور فریاد و فغاں کے غماز ہیں۔

دعا کے شروع میں اپنی عجز و شکنجہ اور خدا کے بزرگ و برتر کے ایصالِ عہد کا ذکر ہے۔ عہدِ خداوندی کو سیکڑوں پٹاروں سے بھی مضبوط تر اور اپنے عہد کو تنکے کی طرح ہلکا پھلکا قرار دیا ہے جو ہلکی سی ہوا چلنے سے بھی اپنی جگہ سے ہل جاتا ہے۔ پھر التجا ہوتی ہے: بارِ الہا! اپنی اس قدرت کے صدقے میں جو تجھے ہماری نیرنگیوں اور بوجھبیسوں پر ہے، ہم پر رحمت فرما، ہم اپنے آپ کو اور اپنی ذلت و رسوائی کو دیکھ چکے، اب ہمیں مزید آفات و آفتوں میں نہ ڈال تاکہ تیرے لطف و کرم سے ہماری دیگر رسوائیوں پر پردہ ہی پڑا رہے۔ تیری ذاتِ اقدس کی بخشش و عنایت اور لطف و عطوفت بے حد و بے پایاں ہے تو ہماری ضلالت و گمراہی کی کوئی حد نہیں۔ اے کریم! اپنے اس بے اندازہ کرم کو اس بے مایہ خاک کی مٹھی کی ان گنت اور بے شمار لغزشوں اور کوتاہیوں پر غالب و مسلط فرما۔ ہمارے لباسِ انسانی کا صرف ایک تار بچا رہ گیا ہے۔ ہم اگر شہر تھے تو اب صرف دیوار کی صورت باقی رہ گئے ہیں۔ یا سلطانِ عالمیاں! ہماری اس بچی ہوئی پونجی کو بچالے، ایسا نہ ہو شیطان کو خوش ہونے کا موقع مل جائے، ہمارے لیے نہیں اپنے اس لطفِ قدیم کی خاطر جو بخشش کے لیے گناہ گاروں اور خطاکاروں کو تلاش کرتا ہے (ہماری اس پونجی کی حفاظت فرما۔ ہم نیکیوں کی تمام قوتیں فنا کر چکے ان کے فقط آثار ہی باقی رہ گئے ہیں)۔

دفتر سوم میں عہد حضرت داؤد علیہ السلام کے ایک شخص کی داستان بیان ہوئی ہے جو شب و روز خدا کے حضور یہ دعا کرتا کہ اے کسی محنت و مشقت کے بغیر حلال کی روزی نصیب ہو۔ یہ دعا چونکہ خود مولانا کی بجائے کسی دوسرے شخص کی ہے اس لیے اس میں اس خلوص، رقت، خشوع، احساس عجز و بے چارگی اور دل کی گہرائیوں سے لنگھنے والی فریاد و فغاں کی صورت نظر نہیں آتی جو مولانا کی اپنی دعا کا خاصہ ہے اور جسے پڑھ کر خود قاری پر مولانا کی سی کیفیت طاری ہو جاتی ہے اور وہ بھی ہاتھ اٹھا کر مولانا کے ساتھ دعا مانگنے میں شریک ہو جاتا ہے۔

مذکورہ دعا کاندھ اپنی کاہلی، ہستی اور دیگر نااہلیوں اور کوتاہیوں کا ذمہ دار خدا کو ٹھہراتے ہوئے جس نے اُسے اس حالت میں پیدا کیا، خود کو ایک زخمی پیٹھ والا گدھا قرار دیتا ہے جس پر گھوڑوں اور اونٹوں والا بوجھ لادنا نہیں جاسکتا۔ وہ بار بار اپنی کاہلی اور خدا کی بخشش و عنایت کا ذکر کرتا اور اپنی کاہلی کے حوالے سے روزی کا طلب گار ہوتا ہے۔ وہ اللہ تعالیٰ کی رحمت کو مختلف برائیوں اور مختلف مثالوں سے جوش میں لانے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ خود کو زندگی بھر سائے میں سونے والا کابل کہتا ہے جسے بخشش و لطف و عنایت کا سایہ میسر ہے۔ اس کے مطابق ذات باری ایسے کابلوں اور سایہ میں سونے والوں کو شاید کسی اور منصب سے روزی مہیا کرتی ہے۔ پھر وہ اس کے حضور التجا کرتا ہے کہ پاؤں والے تو خود ہی روزی تلاش کر لیتے ہیں، جن کے پاؤں نہیں ان پر رحم فرما۔ اس ضمن میں وہ بارش اور زمین کی مثال لاتا ہے۔ زمین کے پاؤں نہیں ہیں لیکن تیری رحمت تہ در تہ بادلوں کو اس کی طرف بھیجتی ہے جو بارش کی صورت میں اس کی تشنگی کو دور کر دیتے ہیں۔ دوسری مثال بچے اور ماں کی ہے۔ بچے کے پاؤں چل نہیں سکتے اس کے باوجود ماں کی وساطت سے اس تک روزی پہنچتی ہے۔ سوائے رب کریم! میں تو اچانک اور کسی تکلیف کے بغیر روزی کا خواہاں ہوں اس لیے کہ میرا تجھ سے اس طرح روزی مانگنا ہی میری کوشش اور جدوجہد ہے :

آن یکی در عہد داؤد نبی	نزد ہر دانا و پیش ہر غنی
این دعا میکرد دایم کای خدا	شروقی بی رنج روزی کن مرا
چون مرا تو آفریدی کاہلی	زخم خواری سست جنبی منبلی
بر خیران پشت ریش بی مراد	بار اسبان و اشتران نتوان نہاد

کاہم چون آفریدی ای ملتی روزیم دہ ہم زرد او کاہلی
 کاہم من سایہ خصم در و بخود ختم اندر سایہ احسان وجود
 کاہان و سایہ خسان را مگر روزی بنہادہ ای نوعی دگر
 ہر کہ راہ پاست جوید روزی ہر کہ را پانیت کن دلسوزی
 رزق را می ران بسوی این حوزین ابر را باران بسوی ہر زمین
 چون زمین را پان باشد جو د تو ابر را راند بسوی او د تو
 طفل را چون پان باشد مادرش آید و ریزد وظیفہ بر سرش
 روزی خواہم بنا کہ بی تعب کہ ندارم من ز گوشش مجہ طلب

دفتر سوم ہی میں ایک برگزیدہ شخصیت دقتی اور ان کی کرامات وغیرہ کا ذکر آیا ہے۔ یہ داستان
 کئی حصوں میں بیان ہوئی ہے۔ ایک جگہ ان کا یہ واقعہ مذکور ہوا ہے کہ چند لوگ سمندر کے کنارے
 نماز پڑھنے اور دقتی ان کی امامت کرانے میں مصروف ہیں۔ اچانک ایک کشتی بخنور میں پھنس کر ڈوبنے
 لگتی ہے اور اہل کشتی اپنے بچاؤ کے لیے زور زور سے رونا پیٹنا شروع کر دیتے ہیں۔ ان کے اس
 شور و فغان سے دقتی کی توجہ ادھر پھر جاتی ہے۔ وہاں قیامت کا سماں ہوتا ہے۔ لوگوں کی یہ حالت
 دیکھ کر دقتی کے دل میں ان کے لیے رحم و شفقت کا جذبہ موجزن ہو جاتا ہے، اور وہ ان کی نجات
 کی خاطر حضور حق صلا پادعا بن جاتے ہیں۔ سادہ الفاظ میں ادا کی گئی اس دعائیں دعا کنندہ کی رقت
 شمع کی جھلک صاف دکھائی دے رہی ہے۔ ہر چند یہ دعائیں دوسرے آدمی کی زبان سے ادا
 ہوئی ہے لیکن موقع و محل ایسی ہی رقت و حضور کا متقاضی تھا اور مولانا نے اس کا پورا پورا خیال
 رکھا ہے۔ دراصل جیسا کہ دعا کے الفاظ سے پتا چلتا ہے، شروع میں مولانا نے دقتی کی زبان سے اہل
 کشتی ہی کے لیے دعا مانگی ہے لیکن بعد میں دعا کا انداز عمومی ہو گیا ہے اور مولانا اہل کشتی کے بہانے گویا
 ساری امت کی طرف سے نجات و بخشش کے لیے دعائیں مصروف ہو گئے ہیں۔

اس دعائیں اللہ جل جلالہ کی ذات اقدس کو اعلیٰ و عظیم کہہ کر اہل کشتی کے افعال و اعمال سے

درگزر اور ان کی دست گیری فرمانے کی التجا کی گئی ہے۔ پھر گزارش ہوتی ہے کہ اے اللہ! یہ کائنات اور اس کی ہر شے تیری قدرت مطلقہ کے قبضے میں ہے انھیں بخیر و خوبی کنارے پر پہنچا دے۔ اپنی ازلی رحیمی و کریمی کے صدقے ان کی بُرائی اور بدخواہی پر نہ جا۔ تو نے ہماری لغزشوں اور خطاؤں کے باوصف ہمیں ہمارے حق سے زیادہ عطا فرمایا اور کسی معاوضے عوفانے کے بغیر ہمیں بے شمار نعمتوں سے نوازا۔ جس قدر تیری ذات صاحبِ عظمت و جلالت ہے، اسی قدر ہمارے گناہ عظیم و کثیر ہیں۔ ہماری نجات و بخشش تیرے ہی ہاتھ میں ہے... اس دعا میں بھی مولانا نے وقوف کی زبان سے اس فلسفے کو دہرایا ہے کہ دعا کی تعلیم بھی خدا ہی نے دی ہے، چنانچہ کہتے ہیں کہ ہم نے حرص اور لالچ کی آگ میں خود کو جلا ڈالا ہے، اور یہ جو ہم تیرے حضور ہاتھ پھیلانے کھڑے ہیں تو یہ طریقہ بھی تو نے ہی ہمیں بتایا ہے، اسی تعلیم دعا کے صدقے میں، جس کی بنا پر تاریکیاں چھٹ گئیں اور روشنیاں پھیل گئیں، ہماری دست گیری اور رہنمائی فرما اور ہمارے گناہ معاف اور ہماری مشکلیں آسان فرما دے۔

چھٹے دفتر میں کسی طالبِ گنجِ فقر کی داستان بیان ہوئی ہے، جسے اپنی بے صبری اور تعمیل کے سبب ندامت و پشیمانی کا سامنا کرنا پڑا۔ اس داستان کے ایک حصے میں ایک فقیر کی مختصر سی دعا دی گئی ہے کہ میں اپنی اس عجلت سے توبہ کرتا ہوں اور چونکہ تیری ہی ذاتِ اقدس نے دربند کیا ہے تو تو ہی اب اُسے وافرما۔ پھر انسان کے آلودہ ماسوا ہونے، دعا کرنے میں بے ہمز اور اپنے خطا کار و گناہ گار ہونے وغیرہ کا اعتراف ہے۔ رات کے وقت نیند کے غلبے سے، جسے موت کے مشابہ قرار دیا گیا ہے، انسان کی جو حالت ہوتی ہے مولانا اسے مختلف تشبیہات و تشبیہات سے واضح کرتے ہیں۔ پھر رات اور دن کی آمد کے منظر کی نہایت دلکش تصویر کشی کرتے ہوئے انھوں نے سحر کے وقت خدا نے بزرگ و بزرگ کے حضور انسان کی دعا و مناجات اور تسبیح و تہلیل کا ذکر کیا ہے۔ شبِ علامت ہے آفات و ظلمات کی۔ شب کو تنگ آسانی کہہ کر گویا اس کی ہولناکی ظاہر کی ہے۔ آفات سے نجات کے سلسلے میں مولانا رومی نے حضرت یونس علیہ السلام کی قرآنی تلمیح سے استفادہ کیا ہے۔ مولانا کہتے ہیں کہ سحر طلوع ہونے پر یہ کوئی اللہ کے حضور دست بٹھا ہوتا اور اس کے رحم و کرم کی بھیک مانگتا ہے، چشم تیز، گوش باز (کھلے کان)، اور جسم سبک کی تمنا کرتا ہے تاکہ ان کی بدولت وہ کفر و ضلالت اور آفات و ظلمات کی چیرہ دستیوں سے خود کو محفوظ رکھ سکے، اور ظاہر ہے ان حالات میں صرف اسی ذاتِ باری کا دامنِ رحمت نقصان سے انسان کی نجات ممکن ہے۔

مولانا بار بار دینہ بینا کی دعا کرتے ہیں تاکہ اس کی بدولت گناہ اور ثواب، اور خوب اور بد کی پہچان ہو سکے۔ اس ضمن میں مولانا نے پھر ایک قرآنی تلمیح (ساحرانِ دربارِ فرعون اور حضرت موسیٰ سے متعلق) پیش کی ہے۔ ساحروں نے دربارِ فرعون میں حضرت موسیٰ کا معجزہ دیکھا تو ہر قسم کے خوف سے بے پروا ہو کر یہ کہہ دیا تھا کہ ہم رب موسیٰ و ہارون پر ایمان لاتے۔ مولانا کا استدلال یہ ہے کہ رب علیل کی طرف سے دینہ بینا عطا ہونے پر انھیں یہ مقام حاصل ہوا ورنہ اس سے قبل وہ گویا اندھے تھے۔ یہ کہہ کر مولانا اللہ تعالیٰ کی رحمتوں کا ذکر اور بگڑی بنانے کی دعا کرتے ہیں۔ اس سے پہلے وہ دو ایک دعاؤں میں حضرت آدم کی توبہ کا حوالہ دے آئے ہیں، یہاں پھر کہتے ہیں کہ یہ دعا بھی خود خدا ہی نے انسان کو اولِ آفرینش سے سکھائی ہے ورنہ اس خاکی وفا کی کیا مجال جو اس ذاتِ گرامی سے یوں مخاطب ہو سکتا۔ وہ رحمتِ خداوندی کو جوش میں لانے کے لیے اس دعا کو ”تیری اپنی دعا“ کہہ کر اُسے قبول فرماتے ہیں:

ہر کی گوید بہنگام سحر	چون ز بطن حوتِ شب آید بدر
کای کریمی کا ندر این لیل وحش	گنجِ رحمتِ نبی و چندینِ حش
چشمِ تیز و گوشِ باز و تنِ سبک	از شبِ پیچون ننگِ ذوالجَبک
از مقاماتِ وحشِ روزِ بنِ پس	بیچِ نگریزیم ما با چون تو کس
مانعی خواہیم غیر از دیدہ	دیدہ تیزی، گشتی، بگنیدہ
بعد ازین مادیدہ خواہیم از تو بس	تا پیو شد بحرِ خاشاک و خس
ساحرانِ را چشمِ چون رست از غمی	کفِ زنانِ بو ز ندنی این دست و پا
ای بکرہ یارِ ہر اغیار را	ای بدادہ خلعتِ گلِ خار را
خاکِ مارِ اثنائاً پالیز کن	ہیج فی را بارِ دیگرہ چیز کن
این دعا تو امر کردی نہ ابتدا	ورنہ خاکی را چہ نہرہ این ندا
چون دعا مان امر کردی ای عجاب	این دعا ی خویش را کن مستجاب

مشنوی رومی میں بعض دیگر مقامات پر بھی چند دعائیں بیان ہوتی ہیں جو بڑی عمدہ ہیں۔